جمہوریت اور یورپ کی شکست و ریخت

جان وزنر

ترجمہ: احمد بشیر

دانشور سیاستدانوں کا قول ہے کہ فرد کی اخلاقی زندگی اور معاشرے کی سیاسی زندگی میں حیرت انگیز حد تک قریبی تعلق ہے۔ معاشرہ کئی اعتبار سے فرد اکبر ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو معاشرے کو محض دلیل کی بنیاد پر یا منطقی اقدام سے چلانا ناکافی ہے۔ معاشرے کو منطقی طریق پر چلانے کے لئے قانون کا استعمال بھی اسی وجہ سے ناکافی ہے۔ معاشرہ بھی فرد کی طرح عقل سے ماورا ہے اور جب فرد یا معاشرہ کوئی عمل کرتا ہے تو اس میں دلیل کا عمل دخل صرف جزوی ہوتا ہے۔

عقل کے اختیارات پر حد بندی کلیتہً گناہ یا صرف سفلی، احمقانہ اور بے قابو جذبات ہی نہیں کرتے ہر چند کہ معاشرے اور فرد کے لیے جذبات اور گناہ کو قابو میں رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا لازمی ہے۔ دراصل انسان کا نفس امارہ ہی عقل کے اختیارات کی تحدید نہیں کرتا بلکہ نفس مطمئنہ یا اسکی لطافت کی بلندی بھی یہی کام سرانجام دیتی ہے۔ انسان کی زندگی کا مطمع نظر اس دنیا، جہاں عقل کی فرمانروائی ہے، سے بہت پرے ہے اور اس کی تگ و تاز کی حد مابعد الطبیعیاتی یا لاہوتی دنیا تک ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں۔

عقل ایسے حالات پیدا کرنا از بس ضروری ہیں جہاں لوگوں کے متعلق اخلاقی فیصلے باحسن طریق انجام دیئے جا سکیں۔ مثلاً تکلیف دہ اور بیزار کرنے والے مصائب اور طبعی حوادث کے زخموں کا جو زندگی کا خاصہ ہیں، اثر کم کرنا۔ لیکن جب بھی کبھی فیصلہ کن مرحلہ آتا ہے تو عقل دستبردار ہو جاتی ہے اور اسے جو وقت پر قرار نہیں ملتا ہے تو اس کا کوئی چارہ نہیں کیونکہ یہ اس قدر تیز گام نہیں کہ وہ حقائق کی تندی حرکت کا ساتھ دے سکے جن سے لوگوں کا واسطہ پڑتا ہے۔ نیز اس کی رسائی ان غیر مرئی اور غیر متعین روحانی عوامل تک نہیں ہوتی جو حقیقت میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔

عقل اس وقت دستبردار ہو جاتی ہے جب ایک مناسب ترین منطقی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ ہر اہم مرحلے پر آخری فیصلہ دل کا ہی ہوتا ہے اور اس کے نتائج کا انحصار فرد کی جرأت، ایمان اور وجدانی

پر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جراُت، ایمان اور مردانگی کے بغیر زندگی ناممکن ہے ماسوا اس کے کہ بسر اوقات کے لئے کسی غیر کا اجیر یا طفیلی ہو کر رہا جائے۔ یہ صرف ایمان اور جراُت ہی ہیں جو انسان کے فکر و عمل کو حریت کی روشنی عطا کرتے ہیں۔ عقل کا اس میں حصہ بطور ایک اصول کفایت شعاری (Principle of Economy) کے ہوتا ہے جو ایمان کو تقویت اور بلندی عطا کرتا ہے۔

سیاسی آزادی میں بھی ایسے ہی حالات کارفرما ہیں۔ ایسا کوئی قانون نہیں جو ایک شہری کو آزادی کا عطیہ دے یا کسی قوم کو آزادی کا پروانہ عنایت کردے۔ سیاسی آزادی بھی اخلاقی آزادی کی طرح تاریخی حقائق پر جراُت اور ایمان کے ساتھ عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہر قوم کو ہر قدم پہ ان تاریخی حقائق کا سامنا رہتا ہے جو ہمیشہ کسل مند، اور فیصلہ کرنے کے نااہل قوم کو مغلوب کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ قانون سیاسی معاملات میں عقل کا ایک اصول ہے۔ یہ معاشرے کی ہیئت، تشخص، کردار اور مقاصد کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن جہاز کے ڈھانچے کی طرح یہ ایک جامد اور غیر جاندار فریم ورک ہے۔ یہ تاریخ کے خطرناک اور ہر لحظہ تغیر پذیر تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے ناقابل ہے۔

تاریخ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے اور معاشرے میں قانون کے ذریعے عقل و منطق کا نفوذ ناکافی ہے۔ اخلاقی زندگی کی طرح سیاسی زندگی میں بھی یہ ضروری ہے کہ تاریخی تقاضوں سے نپٹنے کے لئے سیاسی فیصلے ایمان پر مبنی ہوں۔ لہٰذا قوم کو بھی فرد کی طرح عقل کی رہنمائی کی ضرورت صرف اس حد تک ہوتی ہے جہاں مادی دنیا ختم ہو جاتی ہے اور معاملات غیر مادی، غیر مرئی اور روحانی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص مشیتِ ایزدی میں جھانک نہیں سکتا نہ وہ تاریخ کا انجام دیکھ سکتا ہے۔

جو چیز کسی فرد کی اخلاقی زندگی کی سعی بلیغ کا جواز بنتی ہے وہ اس کی مابعد الطبعیاتی یا لاہوتی منزل ہے۔ یعنی خدا کی خوشنودی یا جنت کا حصول، جو بھی اور جیسا بھی اس کا تصور ہو۔ بعینہ سیاسی زندگی کی جدوجہد کا جواز بھی روحانی منزل ہے جو سیاسی معاملات میں کسی قوم کا تاریخی مقصود بنتا ہے۔ عظیم اقوام کئی نسلوں تک افراد کی جدوجہد ایسی روحانی منزل پر مرکوز کئے رکھتے ہیں جو افراد کی نگاہ سے اوجھل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اس کا صحیح ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ قوم منزل مراد پا لیتی ہے اور جدوجہد کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ صرف ایمان، جراُت اور مردانگی کے طفیل ہے کہ عظیم اقوام منزل مقصود کی راہ میں نسل بانسل تک قربانیاں دیتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی منزل جو نہ تو دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی وہ ادراک میں آسکتی

ہے۔ بالآخر اس منزل کے راستہ میں حائل وہ تاریخی رکاوٹوں کو عبور کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔

سیاسی تحریکیں بھی فرد کی اخلاقی جدوجہد کی طرح ایثار طلب ہوتی ہیں اور جرأت اور ایمان سے حرارت و تقویت حاصل کرتی ہیں۔ اگر آزادی کا مطلب اخلاقی اور تاریخی حقیقت کو عبور کرنا ہے تو یہ آزادی فرد اور قوم دونوں سے نظم، بے غرضی اور ایثار کا نذرانہ مانگتی ہے۔

اخلاقی ڈسپلن یا نظم مختصر الفاظ میں ماورائی منزل تک رسائی کے لئے غیر متشکل زندہ انسانی قوت کو قابو میں لانے، جوتنے اور صحیح ڈگر پر چلانے کا نام ہے۔ نظم کے بغیر یہ عظیم قوت منتشر اور پراگندہ ہو جائے گی اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اور اگر نظم صحیح نہیں یا اسے بھونڈے انداز سے استعمال کیا گیا ہے یا یہ کسی ناگہانی آفت سے دوچار ہو کر درہم برہم ہو جاتا ہے تو بھی عظیم زندہ انسانی قوت پھٹ سکتی ہے لہٰذا فرد کی زندگی تھوڑے بہت اخلاقی نظم کے بغیر محال ہے اور نظم جتنا اعلیٰ ہوگا زندگی اس حساب سے بلند و بالا ہوگی۔ اسی طرح معاشرتی نظم کا منشا بھی معاشرے کی غیر متشکل زندہ توانائی کو قابو میں لا کر اسے قوم کی ان دیکھی منزل مراد تک لے جاتا ہے۔ نظم کے بغیر معاشرہ بہت جلد کسی نتیجے کے بغیر منتشر ہو جاتا ہے۔ اگر افرادی یا معاشرتی نظم صحیح نہ ہو یا حکومت اسے احمقانہ طور پر استعمال کرے یا کسی بیرونی تاریخی حادثہ مثلاً حملے وغیرہ سے وہ درہم برہم ہو جائے تو معاشرہ اس بوجھ اور اذیت سے نجات پانے کی غرض سے (جیسے حکومت سمجھ نہیں سکتی اور خیال کرتی ہے کہ وہ معاشرے کی قوت برداشت کے مطابق ہے) پھٹ سکتا ہے۔ گو یہ بھی صحیح ہے کہ معاشرے کی شکست و ریخت کے اور اسباب بھی ہیں جنہیں انقلاب پسند لوگ اکثر اپنی دلیل کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔

فرد کی زندگی کی طرح سیاسی زندگی میں بھی نظم جتنا اعلےٰ ہوگا سیاسی زندگی بھی اس لحاظ سے ارفع و اعلےٰ ہوگی۔ قوتِ عمل اسی تناسب سے زیادہ ہوگی اور اسی لحاظ سے قربانیاں زیادہ شاندار اور نتائج زیادہ ثمر آور ہوں گے۔ معاشرتی نظم کا مقصود لوگوں کی قربانیوں سے حاصل شدہ اخلاقی قوت کو مناسب وقت اور مقام پر استعمال کر کے قوم کو ان دیکھی اور غیر محسوس روحانی منزل کی طرف چلانا ہے۔ اقوام کی تاریخی منزل فطرت مقرر کرتی ہے۔ اگر کسی قوم کے لئے کوئی بہت عظیم منزل متعین کی گئی ہے تو اس کا معاشرتی نظم بھی اسی اعتبار سے اعلےٰ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ نظم سہل قابل برداشت اور لچکدار ہونا چاہیئے تاکہ زندگی گھٹن کے بغیر رواں دواں رہے اور دباؤ اور تشدد کے بغیر جاری رہ سکے۔ یہ عمومی حیاتیاتی اصول کا ایک پہلو ہے کہ اعلےٰ زندگی اعلےٰ تنظیم کی پیداوار ہے۔

لیکن ایک ارفع اخلاقی، حیاتیاتی یا سیاسی تنظیم کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرور معقول (Rational) بھی ہو۔ بجا ہے کہ زندگی کا تقاضا ہے کہ وہ عقل و دانش کے مطابق ہو۔ لیکن اس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ وہ حقیقت کے بھی مطابق ہو خواہ وہ حقیقت ان دیکھی اور سمجھ سے بالاتر ہو۔ دوسرے الفاظ میں خواہ وہ معقول (عقل کے معیار پر پوری اترتی) ہو یا نہ ہو۔ اس لحاظ سے حکومت کو نظام مملکت چلانے کے لئے اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ عقل کی سطح سے آگے لوگوں سے رابطہ قائم کرے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حکومت غیر معقول (Irrational) قوت کے بغیر ناممکن ہے۔ قوت معاندت کا جواب ہے نہ کہ عقل و دلیل کا۔ اسی طرح حکومت محبت کے بغیر ناممکن ہے۔ کوئی حکومت عوام کو عظیم قربانیوں پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ حکومت کو اتنا ہی عزیز نہ جانتے ہوں جتنا کہ اپنے بلند مقاصد کو۔ نظام مملکت ٹھیک طور سے چلانے کے لئے ہر حکومت کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ رعایا کو عقل، خوف اور محبت کے نام پر اپیل کر سکے۔ اگر ان تین عوامل میں سے ایک بھی کم ہو تو حکومت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور قوم غلامی کی نذر ہو جاتی ہے یا طوائف الملوکی کی، یا دونوں کی۔

عقل کے برعکس محبت اور خوف روحانی اقدار ہیں۔ وہ عقل سے ماورا ہیں۔ اور حکومت کے کاروبار کو کامیابی سے چلانے کے لئے مذہبی سند (Sanction) کی ضرورت ہے۔ سیاسی معاملات میں عوام کے مذہبی اور روحانی جذبات، خدا، جنت اور مذہب سے منتقل ہو کر حکومت سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ روحانی جذبات کی دنیوی و مادی مقاصد کی طرف منتقلی دوسرے معاملات میں بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ادب میں۔ اچھے اخلاق سے مزین اور اپنے مقصود کے لئے پرجوش و مستعد عوام معاشرتی اتھارٹی سے بالعموم اور حکومت سے بالخصوص منسلک رہتے ہیں کیونکہ مقصود کے حصول میں وہ حکومت کو اپنا مستعد کارندہ سمجھ کر محبت کرتے ہیں اور انہیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ حکومت تاریخی منزل (جس سے راعی اور رعایا دونوں کو محبت ہے) کی تحصیل کے لئے ہر ممکن سعی کر رہی ہے۔

دراصل ایک مضبوط و توانا اور انتہائی طور پر منظم اور بارور معاشرے میں حکومت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخی حقائق کے آثار و شواہد سمجھے اور پھر انہیں احکام کی صورت میں عوام تک پہنچائے۔ کیونکہ عوام نشیبی سطح پر ہونے کے باعث ان آثار کو دیکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اسی طرح حکومت کا کام یہ بھی ہے کہ وہ عوام کے وسائل اور ان کی قوت و ہمت اور شکیب سے ہر وقت باخبر رہے۔ اور انہیں

حقائق کے تقاضوں سے نپٹنے میں استعمال کرے۔ حکومت مذہب کی طرح جنت اور عوام کے مابین ایک پل ہے۔ فرق یہ ہے کہ حکومت خدا کی مشیت کی ترجمانی مادی و دنیوی معاملات میں کرتی ہے جب کہ مذہب (Church) مابعدالطبعیاتی یا روحانی ترجمانی کرتا ہے۔

سیاست خدا اور انسان کے درمیان مذاکرہ ہے۔ اور سیاسی پارٹیوں کے مابین اختلافات اور جھگڑے اس وقت شروع ہوتے ہیں جب خدا کی مشیت بیّن اور واضح نہیں ہوتی۔ عوام چونکہ اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل میں لگے ہوتے ہیں اس لئے وہ تاریخی حقیقت کے آثار و شواہد نہیں دیکھ سکتے۔ جس کے باعث وہ حکومت پر صحیح اور مؤثر تنقید نہیں کر سکتے لہذا انہیں حکومت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور اس کے احکام کو اعتماد و محبت سے تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

عوام تاریخی عمل کو صرف قربانیوں کی کمی بیشی سے ہی متاثر کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ قربانیاں فیصلہ کُن ہوتی ہیں اور کوئی حکومت کبھی بھی اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ ایمان، محبت اور ایثار سے عاری عوام کے ذریعہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے سکی ہو۔ بعینہٖ محبت اور ایثار کے جذبے سے لبریز عوام نے کبھی کسی ایسی حکومت کو برداشت نہیں کیا جو بزدل اور غیر سنجیدہ ہو اور تاریخی مقصود کے حصول کے لئے عوام کے جذبہ ایثار کو استعمال کرنے کے نا اہل ہو۔

دوسری طرف عوام کے ایمان محبت اور قربانیوں کے طفیل حکومت کو فکر و عمل کی فضا میں حرکت کرنے کی بہت زیادہ آزادی اور اختیار ہوتا ہے۔ تاریخ میں عوام یا تو اپنے مقصود کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں یا پسپا ہوتے ہیں۔ چونکہ حکومت اپنی اعلےٰ پوزیشن کی وجہ سے صحیح صورت حال کو دیکھ سکتی ہے اور آثار کو بھانپ سکتی ہے اور عوام نچلی سطح پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھنے کے ناقابل ہوتے ہیں لہذا وہ جمع شدہ قوت کو حالات اور تقاضوں کے مطابق کمی بیشی سے صحیح وقت پر اور صحیح سمتوں میں استعمال کر سکتی ہے۔ ایک طاقتور حکومت کو قومی معاشی جدوجہد کی ہیئت اور رُخ اختیار کرنے میں بہت آزادی ہوتی ہے۔ حکومت اس بات میں بھی بہت حد تک آزاد ہوتی ہے کہ وہ جنگ اور امن کے معاملات طے کرے، جنگ کے مقاصد متعین کرے اور یہ فیصلہ کرے کہ قوم کو کس حد تک اور کس شدت سے لڑنا چاہیئے۔ نیز خارجہ پالیسی وضع کرنے میں بھی اسے کافی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور قوم کے مختلف طبقوں کے مابین شکایات و دعاوی کو طے کرانے پر بھی اسے پوری قدرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب قدرت، آزادی اور اختیارات محض فلاح عامہ کے لئے نہیں بلکہ قومی تاریخی منزل مقصود کے حصول میں بھی صرف ہونے چاہیئں

دراصل قومی فلاح و بہبود کا سرچشمہ اسی منزلِ مقصود سے پھوٹتا ہے اور اسی جانب لوٹتا ہے۔

بالفاظ دیگر، سیاست کا مآل خدا کی خوشنودی و رضا ہے۔ اور اگر اس کی رضا و خوشنودی حاصل ہو تو عوام کو خوش اور خوشحال کیا جا سکتا ہے۔ اعلےٰ اخلاق کی حامل حکومتیں بلند نصب العین کی بدولت عوام کا اعتماد اور محبت حاصل کر کے ہی آزادی اور قوت کی پوزیشن پر فائز ہوتی ہیں۔ ایک خدا ترس اور مستعد معاشرے میں (جو خدا کی خوشنودی کے لئے کوشاں ہو) حکومت کے متعلق عوام کی قدر و منزلت بالآخر چھوٹی چھوٹی معاشرتی اتھارٹیوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ سارا معاشرہ ایک کل کی صورت میں اعلےٰ مقاصد کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے۔ تڑپ، مقصدیت اور لچک اس کے ذرہ ذرہ میں سما جاتی ہے۔ ایسے معاشرے میں محبت کی حکومت ہوتی ہے اور ایسے لوگ ملنے مشکل نہیں ہوتے جو اس معاشرے کو برقرار و قائم رکھنے کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ دنیاوی زندگی چونکہ عارضی ہے لہٰذا ہر دم گریز پا اور ایک لحاظ سے بے معنی زندگی کو اعلےٰ مصرف میں لاتے اور خدائے حی و قیوم کی رضا کی خاطر نثار کرنے کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ ایسے معاشرے کے فوجی ملک کے نیک حکمران کے ادنیٰ اشارے پر جان پر کھیل جانا سعادت خیال کرتے ہیں۔ شہری زندگی میں بھی لوگ برضا و رغبت نظم و ضبط کے سلاسل پہن لیتے ہیں اور اپنے صوابدید، ظرف اور مقام کی رعایت سے ہر طرح کا ایثار کرنے پر کمربستہ ہوتے ہیں۔ اس طرح سارا معاشرہ قوت و توانائی اور زندگی کے سوز و ساز سے اُبلنے لگتا ہے۔ اور تاریخ کے اوراق پر ایسا نشان چھوڑ جاتا ہے جو کبھی محو نہیں ہوتا۔ اگر اس کی توانائی کو کسی کارنامے میں صرف نہ کیا جائے تو سارا معاشرہ پھٹ جاتا ہے۔

محبت اور خوف معاشرے کی پاکیزگی تقوے اور تقویت کے لئے سب سے زیادہ کارآمد شے ہیں۔ اور انہی کے توسل سے زیادہ سے زیادہ عمرانی تہذیبی، اخلاقی اور تاریخی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ محض اندازہ نہیں۔ یونانی ادب میں شہری فرائض کی بجا آوری کے ضمن میں محبت اور اخوت کے نام پر ہی اپیلیں کی گئی ہیں۔ اور روم نے محبت کے نظم (Discipline) کو ایسی بلندیوں تک پہنچایا کہ اس کی نظیر پہلے کی تہذیبوں میں تو بالکل ناپید ہے اور بعد میں بھی شاذ ہے۔ لیکن محبت کی بنیادوں پر معاشرے کی تنظیم ماضی ہی میں نہیں تھی۔ اب بھی ہے۔ عیسائیت اور اسلام دونو میں معاشرہ ایک فوق الفطرت مقصد یعنی خدا کی رضا کے گرد گھومتا ہے۔ یہی مقصد عوام کو معاشرتی نظم کی پابندیاں قبول کرنے اور حکمرانوں کے ایما پر جان سپاری پر ابھارتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حکمرانوں اور عوام کے منشا میں کوئی فرق نہیں۔

ایک بلند ماورائی اور تاریخی نصب العین معاشرے کی اعلیٰ تنظیم کے لئے لازمی و لابدی ہے۔ اور تاریخی کارنامے اعلیٰ تنظیم اور بلند نصب العین دونوں کے بغیر ناممکن ہیں۔ لیکن ایک اور قوت بھی ہے جو معاشرتی تنظیم کا باعث بنتی ہے اور وہ ضرورت (Necessity) اور خوف ہے۔ تاریخی حقیقت انفعالی (Passive) نہیں بلکہ ایک فعّال اور بے رحمانہ قوت ہے۔ خدا چونکہ قادرِ مطلق ہے لہٰذا تاریخ (جس میں اس کی قدرت و قوت کا ظہور رہتا ہے) ہر معاشرے کو خواہ وہ کتنا ہی منظم ہو تباہ کر سکتی ہے۔ لیکن معاشرتی موت اور تباہی کو ایک سنجیدہ منصوبہ بندی کے ذریعے سے ٹالا جا سکتا ہے البتہ تاریخی تباہی کو روکنے کے لئے ایک تکلیف دہ اور مالی لحاظ سے گراں سعی بے سود ہے جب تک کہ عوام خیر یا نیکی کے صحیح احساس اور بلند ترین مقاصد سے سرشار نہ ہوں۔ اور اپنی جدوجہد کو حکمت الٰہی کا حصہ نہ سمجھتے ہوں۔ اس بنا پر خیر سے محبت اور موت و تباہی کا خوف جو شر کے مترادف ہے، لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ منزل کی جانب معاشرے کے تاریخی سفر کی کامیابی خیر اور شر میں فرق اور تمیز کرنے میں ہے۔

ماضی میں لوگ ان حقائق سے آگاہ تھے۔ ۱۷۸۹ء کے لبرل (Liberal) انقلاب تک یورپی معاشرے کو اس انداز سے منظم کیا جاتا تھا کہ وہ حالات، معاشرے اور افراد کی باہمی آویزش سے پیدا شدہ مسائل سے پوری طرح عہدا برا ہو سکے۔ محبت کو ایک نہایت کارآمد عمرانی رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ اتھارٹی کو Ascending Hiera کی صورت میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں شہری مسائل بلدیہ حل کرتی تھی۔ صوبائی مسائل صوبے کی ہیئت حاکمہ حل کرتی تھی اور قومی مسائل بادشاہ حل کرتے تھے اور لاطینی سلطنت کے مفادات کی نگہداشت شہنشاہ کرتا تھا۔ اس سسٹم کو مؤثر انداز میں چلانے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کسی روحانی جذبے اور احساس سے سرشار ہوں۔ یہ روحانی احساس شاعرانہ نہیں لیکن اس سے متعلق ضرور ہے۔ تاریخی مقصود کی برتری اور بلندی پر ایمان اتنا مضبوط ہونا چاہیئے کہ فرد تہ عوام بھی اس سے سرشار ہوں۔ اور یہ بات بھی سمجھتے ہوں کہ بلدیہ کا فرض ہے کہ اپنے انتظامی معاملات سدھارنے کے بعد وہ تاریخی مقصود کی تحصیل میں صوبے کی جدوجہد کو مضبوط بنائے اور اس کی پوری مدد کرے۔ مسکین ترین آدمی کو بھی خواہ وہ کمہار ہو یا شتربان یہ پورا احساس ہونا چاہیئے کہ قومی مقصد قابل قدر اور قابل حصول ہے۔ اگر یہ حالت ہو تو معاشرے کی ہر سطح پر اور ہر شعبہ اور ہر عمل میں خواہ وہ معاشی ہو یا تہذیبی، اخلاقی، سیاسی، فوجی

ادبی وغیرہ، ایسے آدمی میسر آجائیں گے جو معاشرے کی خدمت پر کمربستہ اور اس کے استحکام کے لئے قربانیاں کرنے پر تیار ہوں گے۔ اور یہی ایک ہمہ گیر اتھارٹی کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ ایک معاشرے کو جس کا خیر پر ایمان ہو ایسے مستعد اور قابل آدمی ہر ضرورت کے موقع پر بآسانی مل جاتے ہیں۔

دلیل، بحث، تلاش، مطالعہ اور اعداد و شمار ملکی معاملات چلانے کے لئے از بس ضروری ہیں۔ لیکن دلیل یا عقل سست رو ہے۔ مغربی جمہوریتوں میں پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے کمیشن مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ کمیشن مسائل کے حل کی تلاش میں خاصا وقت صرف کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی حل پر پہنچتے ہیں اور یہ حل چاہے صحیح بھی ہو (گو ہمیشہ یوں نہیں ہوتا) تو اس وقت تک سیاسی صورت حال اتنی بدل چکی ہوتی ہے کہ اس حل کا حالات پر صحیح اطلاق نہیں ہوتا۔

جرأت اور ایمان کے بغیر محض عقل کے فیصلے ناکام ہو جاتے ہیں۔ سیاسی معاملات میں عقل کا استعمال اسی صورت میں سودمند ہو سکتا ہے جب فرصت کافی ہو۔ اس لئے اس کی افادیت پیش بینی اور روپیش از وقت حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں ہے۔ خوش قسمتی سے یہی عقل کا جواز ہے۔ اگر عقل پیش بینی سے قاصر ہے تو اس کا قطعی کوئی فائدہ نہیں۔ اگرچہ عقل پیش بینی سے عمل و حرکت کے لئے کچھ وقت حاصل کر سکتی ہے تاہم ضروری نہیں کہ اسے اگلے اقدام کے لئے بھی فرصت مل سکے۔ کیونکہ تاریخ میں دو ہی کردار ہیں۔ آدمی اور حالات کی رو۔ موخرالذکر کو اکثر بہادر اور قوی لوگ کسی حد تک پابند تو کر سکتے ہیں لیکن اسے کلیتہً قابو میں لانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ فکر سے عمل تک کسی مناسب تیاری کے بغیر پہنچنے کی اہمیت جنگ میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ہر قابل ذکر فوج میں جرنیل کے گرد ایسے افسر ہوتے ہیں جو اس کے لئے عقل اور سوچ کا کام کرتے ہیں۔ جی۔۱ جوانوں کو منظم کرتا ہے۔ جی۔۲ دشمن کے ٹھکانوں کا پتہ چلاتا ہے۔ جی۔۴ سپلائی کا کام کرتا ہے اور جی۔۳ ان تینوں افسروں کے مہیا کردہ مواد اطلاعات اور وسائل کے مطابق منصوبہ بندی کر کے کمان کے اپریشن کے لئے افسر اعلےٰ کو پیش کرتا ہے۔ ان میں سے کسی افسر کو بھی خواہ وہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو کمان کا فیصلہ سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام صرف جی۔۶ یعنی جرنیل کا ہوتا ہے۔ سٹاف افسروں کو فیصلہ اور ذمہ داری نہ سونپنے اور اسے صرف جرنیل تک محدود رکھنے کی دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ محبت پر مبنی ہے۔ بالعموم اسے تسلیم کیا جاتا ہے کہ جرنیل کی فراست، خیر سے شدتِ محبت کی بنا پر عقل کی حدود سے پرے دیکھ سکنے کے قابل ہوتی ہے اور وہ خود ایمان اور بصیرت سے عمل کرنے کے قابل ہوتا ہے، چونکہ یہ دونوں قدریں، یعنی ایمان اور بصیرت، عقل

سے ماوراہیں اس لئے وہ اپنے ماتحت افسروں کو فیصلے کی نوعیت نہیں بتا سکتا۔ فوجی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات گذرے ہیں۔ اور آج تک ایسا کوئی اچھا جرنیل نہیں گذرا جس نے اہم ترین موقعہ اور فیصلہ کُن مرحلہ پر افواج قاہرہ کے ربّ اعلےٰ کا اشارہ نہ پایا ہو اور ملہمانہ اقدام نہ کیا ہو۔

پھر کسی لمحہ بھی سٹاف افسروں کے پلان اور نظریات درہم برہم ہو سکتے ہیں یا دشمن کی کسی کامیاب چال سے تمام اندازے اور حساب الٹ پلٹ ہو سکتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو سٹاف افسروں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ لمبی نشستیں کر کے کوئی نیا پلان وضع کریں۔ اس وقت جرنیل اپنی بصیرت اور روح کی اندرونی مردانگی (جن کے باعث وہ اس عہدہ جلیلہ پر پہنچتا ہے) کو کام میں لا کر ایمان اور جرأت سے کوئی فوری فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کا محرک خوف ہے۔ خوف اور عشق باہم مل کر کام کرتے ہیں۔ اور جب یہ دونوں ملتے ہیں تو نہایت شاندار اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

تاریخ، جو کہ معاشرے اور مملکت دونوں کا موضوع ہے، دشمن کی فوج کی طرح تندی و تیزی و قوت سے، جارحانہ، غیر متوقع انداز اور سنگ دلی سے حرکت کرتی ہے۔ اس کے متعلق یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ایک معین اور متعین راستہ پر ہی چلے گی۔ جیسے میدان جنگ میں دشمن کی چالوں کو کسی حد تک جانچا جا سکتا ہے اور اس کے حسب حال اقدام کیا جا سکتا ہے اسی طرح تاریخ کے اندر بھی کسی حد تک جھانکا جا سکتا ہے اور اس کے مطابق مناسب اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ یہ صلاحیت جرنیل کی صلاحیت کی طرح کوئی عقلی صلاحیت نہیں ہوتی، ہر چند کہ عقل کا اس میں کچھ عمل دخل ضرور ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جو سیاسی معاملات میں خدا سے تعلق پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ تمام صلاحیتیں خواہ کسی مصور میں ہوں یا شاعر میں یا جُفت ساز میں، جب وہ ان کے مالک کو علم و فن اور قابلیت کی عام سطح سے بہت بلند لے جاتی ہیں تو یہ خدا سے تعلق اور راز و نیاز کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے رشتے لاہوتی دنیا سے جا ملتے ہیں۔ اصل میں ہر تابندہ کارنامہ ملہمانہ ہوتا ہے۔

اس بنا پر کسی مملکت کی قدرتی تنظیم ملوکیت کی طرف راجع ہے۔ ملوکیت کی ابتدا بھی یوں ہوئی کہ اوّل اوّل معاشرے کو جب خوفناک حقائق کا سامنا ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے نیک ترین، مضبوط ترین اور اصلح آدمی کو اپنا حاکم یا بادشاہ چن لیا۔ اور اس کے ہر حکم پر پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ جوں جوں معاشرے کو اپنے تشخص کا احساس ہوتا گیا (جو اعلےٰ مقصود کا صلہ ہوتا ہے) اور اپنے مقصود کی برتری پر ان کا ایمان پختہ ہوتا گیا۔ شاہی طرز حکومت کی اہمیت بڑھتی گئی۔ جوں ہی کسی معاشرے میں اپنے

تشخص کا احساس بڑھتا جاتا ہے، خیر کے متعلق اس کا نکتہ نظر زیادہ صاف ہوتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی شر (موت اور تباہی) کا خوف بھی اسی نسبت سے بڑھتا جاتا ہے۔ اخلاقی حس زیادہ لطیف ہو جاتی ہے اور ہر شہری کے دل میں اپنی صوابدید کے مطابق اپنی ذمہ داریاں اور فرائض کو احسن انداز سے نبھانے کا احساس شدید ہوتا جاتا ہے۔ مدنی آزادی بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ آزادی ایک تکون کی صورت میں ہوتی ہے، جس کی چوٹی تاریخی نصب العین کی طرف اٹھی ہوتی ہے۔ مدنی آزادی فلاح عامہ سے منسلک ہوتی ہے۔ شک و شبہ کی صورت میں اتھارٹی شہریوں کی رہنمائی کرتی ہے اور اتھارٹی کی چوٹی پر بادشاہ ہوتا ہے۔ جسے ظلِ الٰہی سمجھا جاتا ہے۔

یورپ میں کبھی ان باتوں کا صحیح علم اور تصور تھا اور محولہ بالا معاشرتی نظام بہترین انداز سے منظم اور بہت ترقی یافتہ تھا۔ اسی بنا پر یورپی اقوام نے صدیوں تک نہایت شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔ ان کا زندگی کا تصور اتنا وسیع تھا کہ اس میں مختلف النوع قسم کی خیالات و نظریات پنپ سکتے تھے اور یہ تصور آبادی کی اکثریت پر محیط تھا۔ جس کی وجہ سے سارا معاشرہ یقین محکم کے رشتہ میں بندھا ہوا تھا۔ جب معاشرتی توانائی جو اس نظام کی پیداوار تھی مشکل اور اونچے قسم کے مسائل پیدا کرتی تو معاشرتی تنظیم اور مزید لطیف اور منتشرہ ہو جاتی۔ ایک ایسی اتھارٹی پر سب کا اتفاق ہو جاتا جو اونچی سطح پر عوام کی رہنمائی کرتی۔ اور تنظیم جتنی اعلےٰ ہوتی جاتی زندگی اور مسائل اسی حساب سے بلند ہوتے جاتے۔ حتیٰ کہ وہ اتنے لطیف اور پیچیدہ ہو جاتے کہ وہ عقل کے اختیارات اور طاقت سے بلند ہو جاتے۔ اور فوج کی طرح صرف ایک آدمی پر اعتماد کیا جاتا جو ان مسائل کو عقل کی سطح سے بلند ہو کر خدا کی مدد سے حل کرنے پر قادر نظر آتا۔ فوج کے کمانڈر جرنیل کی طرح بادشاہ کا بھی خدا سے خاص تعلق سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی دوسرا دخیل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اعلےٰ ترین حکومت کے لئے ملوکیت قطعی طور پر ضروری نہیں۔ لیکن یہ ایک قدرتی سیاسی نظام ہے جس سے سیاسی توانائی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بظاہر سب سے زیادہ مستعد نظام ہے۔ لیکن جہاں اخلاقی توانائی خاصی بلندی پر ہو اور مدنی نظم و محبت معاشرے میں جاری و ساری ہو وہاں ملوکیت کی ضرورت نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر ۴۹۰ قبل مسیح میں روما میں جب نچلے طبقے کے لوگ (PLEBIANS) مونز ساکرم (Mons Sacrum) کو ہجرت کر گئے تو وہاں کوئی بادشاہ نہیں تھا لیکن ان میں باہمی محبت اتنی زیادہ تھی کہ ایک عام شہری "مینینی اس" (Menenius) عامتہ الناس اور خواص (Patricians) کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

حد یہ ہے کہ وہاں کی آمریت میں بھی ملوکیت کی طرح اعلیٰ حکمران خطرے اور ضرورت کے وقت خدا سے تعلق کی بنا پر اس کے نام پر ہی اپیل کرتا تھا۔

جب تک محبت کی حکمرانی ہوتی ہے سب معاملات ٹھیک ہوتے ہیں اور یورپ میں بھی جب تک محبت کی علمداری رہی معاملات ٹھیک رہے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں یورپی اقوام ایمان اور اعلیٰ اخلاق سے اکتا گئیں اور ان کا یقین اور اخلاق ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ کوئی شخص بھی جو اخلاق حمیدہ سے متصف ہو اور اعلیٰ سیاسی اور تہذیبی زندگی سے متمتع ہو، ان اوصاف اور آسائشوں کو ترک نہیں کرتا۔

جب زوال کا آغاز ہوتا ہے تو سعی میں کفایت کی کوشش کی جاتی ہے لیکن روحانی و مادی زندگی کے پیمانے کو کم نہیں کیا جاتا۔ مکارم اخلاق کو حشو و زوائد سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے تاہم توقع کی جاتی ہے کہ اخلاق کا ڈھانچہ برقرار رہے۔ جونہی جوش اور ولولہ کم ہوتا ہے انسان کے بلند ترین مقاصد بے آسرا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یورپ میں اٹھارھویں صدی تک اہم ترین سیاسی فرائض ملوکیتیں سرانجام دیا کرتی تھیں۔ جیسے ہی ایمان متزلزل ہوا ملوکیتوں کی شاندار اور بلند و بالا سعی کا جواز ماند پڑ گیا۔ فرض اور عدل کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اور اس کی جگہ دولت، آرام طلبی اور عافیت کوشی نے لے لی۔ سیاسی زندگی کا مقصد عدل کے بجائے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ فوائد کا حصول قرار پایا۔ ملوکیتوں کے بلند تقاضوں کو غیر معقول اور آمرانہ سمجھا جانے لگا۔ روحانی نصب العین معاشرے کی تکوین و تنظیم کا جواز نہ رہا۔ اور مذہبی روشن خیالی (ENLIGHTENMENT) نے وحشیانہ گاتھک GOTHIC غیر معقولیت کی صورت میں معروف عمرانی اقدار کو سخت ضعف پہنچایا۔ حقیقت میں یورپی عیسائی معاشرہ حق اور عدل کے حصول کی بنا پر نہایت معقول انداز سے استوار تھا۔ حق اور انصاف کی بنا پر معاشرے کی معقول تنظیم اور شے ہے اور قوت، دولت اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کی بنا پر معاشرے کی تنظیم دوسری شے ہے۔ حقیقت میں حق و عدل کی سعی اکثر دولت اور خوشحالی کی دوڑ دھوپ میں مخل ہوتی ہے اور یہ خلل اندازی ان لوگوں کو بہت ناگوار اور غیر معقول لگتی ہے جو اعلیٰ اقدار اور عدل سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اور جن کا مطمع نظر آرام کوشی اور جاہ طلبی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر اٹھارھویں صدی کے اعتدال پسندوں (LIBERALS) کا خیال تھا کہ وہ عقل و منطق کی نام پر اپنے لائے ہوئے انقلاب کو حق بجانب ثابت کر سکیں گے۔

لیکن جب اعتدال پسند حق اور عدل کی روحانی اقدار سے ہٹ کر معاشی خوشحالی و مادی ترقی کی

بنا پر معاشرے کی سائنسی تعمیرِ نو میں مصروف تھے تو عیسائی معاشرے کے اعلٰے ارکان نے اس سعی میں مداخلت کی کوشش کی اور وہ عوام کو عیسائیت کے نام پر اعلٰے اقدار اور روحانی مقاصد کی خاطر قربانیوں پر اکساتے رہے۔ عیسائی ملوکیتوں کی فوق الفطرت منطق مذہبی روشن خیالی (ENLIGHTENMENT) کے فیلسوفوں کی مادی منطق کی ہمدم نہ بن سکی۔ اس لئے فیلسوفوں نے ہوش و خرد کو تھوڑی دیر کے لئے خیر باد کہتے ہوئے شاہ فرانس کا سر قلم کر دیا۔ اور ان کے نمائندہ نپولین نے یورپ کے باقی ماندہ بادشاہوں کی روحانی طور پہ کمر توڑ کر رکھ دی۔

اس چپقلش کا یہ منشا ہر گز نہیں تھا کہ عیسائی ملوکیتوں کی شہری آزادی، تہذیبی سرمایہ، دولت یا قوت کو نقصان پہنچایا جائے۔ حقیقت میں حکومت کا اعلٰے فریضہ سمجھا نہیں جا رہا تھا یعنی اخلاقی عمدگی کے باعث جو آزادی نصیب ہوئی ہے اس کی رہنمائی صحیح سمت میں کی جائے۔ اعتدال پسند خلوص دل سے یہ سمجھتے تھے کہ وہ عوام کو اس فرسودہ معاشرتی نظم یا ڈسپلن (جو حق و عدل کے لئے تھا) سے رہا کر کے ان کی آزادی میں اضافہ کر رہے تھے۔ لہٰذا اٹھارہویں صدی میں سارا یورپ معاشرتی آزادی کے نعروں سے گونج اٹھا لیکن نعرے یہ آج کل کہیں بھی سنائی نہیں دے رہے۔

لیکن حقیقت یوں ہے کہ دولت و قوت کے حصول کی بنا پر ایک انتہائی منظم شدہ قوم اپنی دولت اور طاقت کو دیر تک بچا کر نہیں رکھ سکتی تا آنکہ زندگی کی ترقی و ترفیع کے لئے وہ اگلا قدم نہ اٹھائے اور یہ اگلا قدم حق اور عدل کا ہے۔ صرف حق اور عدل ہی دولت اور طاقت کا مناسب اور مؤثر ترین دفاع ہیں۔ غالباً یہ ضروری نہیں کہ دولت مند اور طاقتور بننے کے لئے حق اور عدل کو حاصل کیا جائے۔ جو چیز ضروری ہے وہ صرف یہ ہے کہ راست باز اور عادل بننے کی سنجیدگی سے کوشش کی جائے۔ جو شخص اپنی اندرونی توانائی کے باعث عادل اور راست باز ہے وہ جب بھی چاہے اور جہاں بھی چاہے اپنی طاقت اور قوت کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن جو قوم براہ راست طاقتور بننا چاہتی ہے وہ مضحکہ اور تمسخر کا نشانہ بن جاتی ہے۔ جیسے کہ ویت نام میں امریکہ کا حال ہوا یا انطیا کوس سوم (ANTIOCHUS III) کا یونان میں حشر ہوا۔ ملوکیتوں کو ختم کرنے سے یورپی لوگ اس معاشرتی تنظیم سے محروم ہو گئے جس سے عدل اور حق کی حکمرانی ممکن تھی۔ اور انہیں بہت دیر کے بعد یہ احساس ہوا کہ تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ دولت اور اقتدار روحانی اقدار کے بغیر زیادہ دیر تک قائم رہ سکے ہوں۔ لہٰذا ۱۷۸۹ سے یورپ کی تاریخ اس جہاز کی مانند رہی ہے جس میں پانی بھرا جا رہا ہو اور

وہ ڈوب رہا ہو ۔

ہوں کا اقتدار اعلیٰ ختم ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایک کر کے چھوٹی چھوٹی اتھارٹیاں یعنی نچلی سطح پر مقتدر جماعتیں بھی ختم ہو گئیں۔ محبت اور ایثار کی بنا پر اقتدار کا حصول ناممکن ہو گیا۔ محبت کی جگہ جمہوری مساوات کا مصنوعی اصول رائج ہوا۔ اور صرف اسی استعداد (MERIT) کو ترجیح دی گئی جو عقلیت (RATIONALISM) کے معیار پر پوری اُترتی تھی۔ لیکن جس شخص کا اقتدار محض ایک مخصوص استعداد پر مبنی ہو ضروری نہیں کہ وہ لوگوں کی محبت اور تعظیم بھی حاصل کر سکے حقیقت میں استعداد ایک اضافی چیز ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی اہلیت اور استعداد کا مالک ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ لازمی نہیں کہ ہر شخص کی استعداد مخصوص عقلیت کے مطابق ہو۔

جونہی پرانا معاشرتی نظام ٹوٹا، حکومت اور عوام کے مابین محبت کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اور معاشرے میں واحد رشتہ صرف پیسے کا رہ گیا۔ مگر پیسہ تو کجا، دولت سے بھی عوام کو سنجیدہ قربانیوں پر آمادہ کرنا ناممکن ہے۔ دولت ایک منفی اصول ہے جو قربانیوں پر آمادہ کرنے کے بجائے قربانیوں سے گریز سکھلاتا ہے۔ حق اور انصاف کے بغیر اعتدال پسند (LIBERAL) جمہوری اقوام کی دولت اور قوت نے انہیں تھوڑی دیر کے لئے مضبوط و توانا بنانے کے بعد اندر سے کھوکھلا اور نحیف و نزار کر دیا۔ مساوات کا اصول اتھارٹی کی نفی کرتا ہے اور اقوام کی ذہانت کے شیرازہ کو ختم کر کے تخلیقی قوتوں کو بانجھ کر دیتا ہے۔ اور یہ عقلیت (RATIONALISM) کے اصول کو سیاسیات میں لانے کا ایک عجیب لیکن مجرب نتیجہ ہے۔

لاطینی مغرب میں ہر جگہ حکومت کا اقتدار اعلیٰ اور قوت آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ تک مغربی اقوام نے عقل سے عاری مذہب کا سہارا لیا لیکن اس نے انہیں مزید اخلاقی اور عمرانی پستیوں کی طرف دھکیل دیا۔ کیونکہ یہ قدم ان کی مادی و شہوانی خواہشات کی تسکین و تکمیل اور انہیں جائز قرار دینے کے لئے اٹھایا گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک اس پر قائم نہ رہ سکے۔ "اعتدال پسند عقلیت" کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش ۱۹۱۴ء میں ناکام ہو گئی۔ جب لبرل حکومتیں اپنی معاشی سعی کو قابو میں رکھنے میں بری طرح ناکام ہو گئیں اور سرمایہ پرستوں کی حرص و طمع اور ماحول کی مکمل بربادی کے مابین کوئی چیز حائل نہ رہی۔ قابلیت جانچنے کے لئے ان کے امتحانات روز بروز اپنی وقعت کھوتے گئے۔ ان کی تعلیمی سندات اور ڈگریاں جو قابلیت پرکھنے کی بہترین کسوٹی سمجھی جاتی تھیں، کھوکھلی ہوتی

گئیں۔ ان میں غیر ملکیوں کو متاثر کرنے کی قوت بھی سسکیاں لینے لگی۔ پوری انیسویں صدی میں وہ طاقت کو (جو انہیں آبا و اجداد سے ورثے میں ملی تھی) کسی باعزت اور منصفانہ مصرف میں لانے کے قابل نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۸ء میں ان کی خارجہ پالیسی ایک ہولناک تصادم کا شکار ہو گئی جس کی ذمہ داری انہوں نے لیگ آف نیشنز کے سر پر ڈال دی اس کے بعد عالمی سیاست سے ان کی کنارہ کشی کا آغاز ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔ ان کا قانون تو بازنطینی رہا لیکن حقیقت اور عدل سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ان کی سائنسی ترقی دنیا کے لئے ایک ہوا بن گیا ہے جسے کنٹرول کرنے سے وہ عاجز ہیں اور جواب ایک شیطانی خندہ سے ان کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ میں ہر شہری اپنی بساط کے مطابق آزادی سے متمتع تھا۔ امریکہ کی جنگِ آزادی اس امر کا ثبوت ہے۔ آج بھی یورپ میں کوئی شخص اپنی حکومت سے اس سختی بلکہ گستاخی سے بات نہیں کر سکتا جس طرح ۱۷۷۶ء میں امریکی اپنی حکومت سے مخاطب ہوتے تھے۔ ان ایام میں کسی شہری کے حقوق کو پائمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ ہر شہری اپنے معاشرتی مقام یا عہدہ کی بنا پر یا اپنے پیشہ کی انجمن کے ذریعہ اپنے سے اوپر کی اتھارٹی پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔ لیکن اعتدال پسندوں نے اس نظام کو برباد کر دیا اور اس کی جگہ جمہوری طور پر منتخب اداروں اور پارلیمانوں نے لے لی اور اب یورپ میں ہر جگہ شہری بے آسرا ہو کر رہ گئے ہیں۔ پارلیمانیں یا اسمبلیاں محض عقلیت (RATIONALISM) پر مبنی ہیں۔ اور وہ صرف عقل کو اپیل کر سکتی ہیں محبت اور خوف کو نہیں۔ نتیجتہً پیسے کے معاملات کے سوا جو عقل کی رو سے طے ہو سکتے ہیں (کیونکہ انہیں گنا اور ناپا جا سکتا ہے) وہ عوام کی ضروریات اور خواہشات کے اظہار کا نامناسب ذریعہ ہیں۔ لہٰذا لبرل جمہوری حکومتوں پر عوام کے بجائے گمنام بین الاقوامی سرمایہ کا روں، سنگ دل سائنسدانوں (چاند مریخ اور زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی اپنی دیوانہ سکیموں سمیت) سازشی بدمعاشوں اور ڈاکوؤں اور مصیبت میں پھنسے والے غیر ملکیوں کو کنٹرول اور اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ یورپ میں کہیں بھی اتنی اخلاقی جرأت اور توانائی نہیں رہی کہ وہ ان جونکوں، طفیلیوں اور ناجائز فائدہ اٹھانے والی قوتوں کو اتار پھینکیں۔ ان میں اب حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی سکت ہے نہ خواہش۔ اس کے برعکس عوام اس ڈر سے کہ کہیں ان کی معیشت تباہ نہ ہو جائے مایوسی سے انہی قوتوں سے تعاون پر مجبور ہوتے ہیں جو ان کا استحصال کرتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نوجوانوں کو تہذیب و تمدن کے ڈسپلن کے بوجھ سے نجات دلانے کے لئے تعلیمی نظام دانستہ طور پر سگمنڈ فرائڈ کی کتاب جنس اور تمدن (SEX AND CIVILISATION) کی تعلیمات کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ جو نوجوانوں کو خراب کر کے انہیں تہذیب و تمدن کے تقاضوں اور ڈسپلن سے آزادی پر ابھارتا ہے۔ یہ عمل بالآخر عوام میں غلامانہ ذہنیت پیدا کرتا ہے اور اس سے صرف وہی مملکت فائدہ اٹھا سکتی ہے جس کا مطمع نظر دولت اور قوت ہو۔ ایک اہل حکومت صرف لوگوں کو غلام بنا کر ہی اپنی معیشت برقرار رکھ سکتی ہے۔

یہ اسی روح اور جذبہ سے بہت دور ہے جو کسی قوم کو عظیم بناتی ہے تھسی ڈائڈیز (Thucydides) کا قول ہے کہ کسی غلام کی غلامی پر ترس نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ جو آدمی غلامی کو پسند نہیں کرتا وہ ہر وقت اپنی آزادی کی خاطر جان دینے میں بالکل آزاد ہوتا ہے۔ اسی قسم کی حریت نے یونان کو عظیم بنایا تھا۔ یورپ میں غلامی اور تباہی اس وقت شروع ہوئی جب یورپی اقوام نے اچھائی کے ایسے بلند تصور کو جس کے لئے جان قربان کی جا سکتی ہو، بھلا دیا۔ بنیادی طور پر ان کے مصائب حضرت مسیح پر ایمان ختم ہونے کا نتیجہ ہیں۔ سیاسی طور پر یہ مصائب اس وقت شروع ہوئے جب انہوں نے ملوکیتوں کو ختم کیا جن کی حیثیت عمل کے روحانی تقاضوں اور مادی دنیا کی ناگزیر و المناک (TRAGIC) ضروریات اور حوائج کے مابین ایک پل کی تھی۔

****